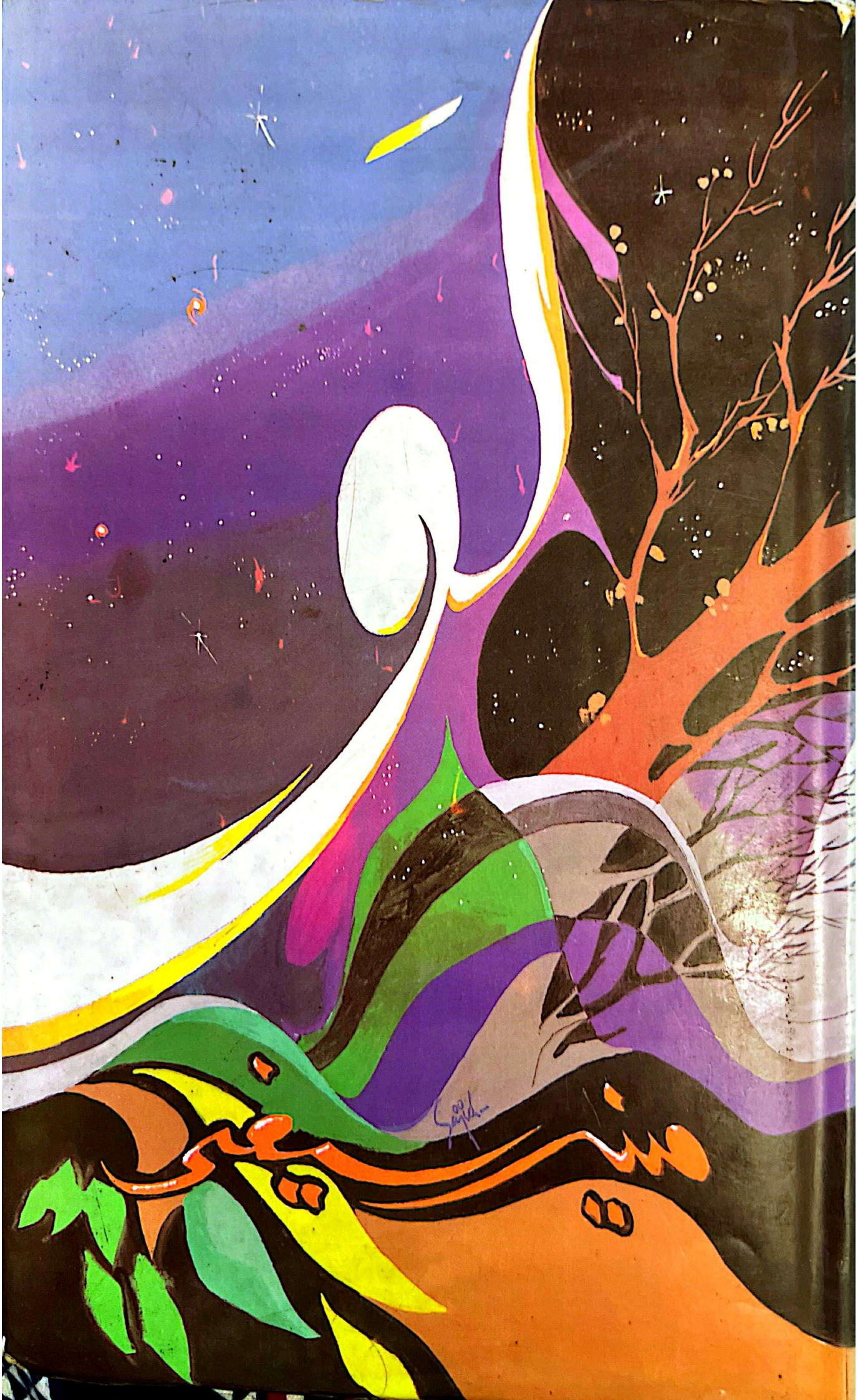

وَ

لَو

منیر سیفی

مکتبہ خوش خیال : اردو مرکز گنپت روڈ لاہور

تقسیم کار :

○ فضلی سنز (پ) لمیٹڈ اردو بازار کراچی
فون: ۲۶۲۹۷۲۰ فیکس: ۹۲-۲۱-۲۶۳۳۸۸۷

○ اشرف بک ایجنسی کمیٹی چوک راولپنڈی

○ کلاسیک ریگل چوک شاہراہ قائداعظم لاہور
فون : ۷۳۱۲۹۷۷-۷۳۲۳۹۶۳

رابطہ بصورت عدم دستیابی کتاب

☆ ساجد علی ساجد (ادبی دائرہ کراچی) فون: ۶۹۹۸۸۴۸
بی ۴۳۹- سیکٹر 11 اے- گلشن عثمان نارتھ کراچی

☆ عبدالوکیل اردو مرکز گنپت روڈ لاہور فون: ۷۳۵۳۱۲۹

☆ اویس منیر ۱۱۴ بی فیصل ٹاؤن لاہور فون : ۵۱۶۷۱۱۴

جملہ حقوق محفوظ

نومبر ۱۹۹۸

اہتمام : محیط اسمٰعیل

سرورق / پس ورق: ساجد

قیمت : ۱۵۰ روپے

زاہد بشیر پرنٹرز لاہور

اویس

اسامہ

اور

مائدہ

کے نام

آرزو مندان اشاعت

صہبا اختر (مرحوم)، شاہد شیدائی

ساجد علی ساجد، حسین مجروح

اور متعدد

ترتیب

دیباچہ: صہبا اختر	۱۳
مجھ کو حیران مری آنکھ کو ششدر کر دے	۱۷
پیش سرکار دل کی بات گزار	۱۹
گم اگر دولت اقلیم نہیں ہو سکتی	۲۱
ندی تھا وہ دریا تھا سمندر تھا وہ کیا تھا	۲۳
یوں تو کیا کیا لوگ چھپے تھے دروازوں کے پیچھے	۲۵
جلا بھی شدت جاں سے بجھا بھی شان سے تھا	۲۷

مجھ پہ جب اپنا انکشاف ہو	۲۹
ہواؤں کو اگر ہے تازہ رکھنا	۳۱
کہاں تک عشق سے انکار ایسے	۳۳
اور ہوا دیتے ہیں میری بے چینی کو میرے خواب	۳۵
اونچے نیچے پلڑوں کے بارے میں کیا منھ کھولوں	۳۷
قریہ قریہ چھان چکا جب قطرہ قطرہ بارش کا	۳۹
کتنا ترساہوں میں اس انجمن آرائی کو	۴۱
در و دیوار کسی اور کے گھر میرا ہے	۴۳
لہو کا ذائقہ ہی جب زبان تک نہ گیا	۴۵
خوف تخریب و شر مجھے بھی ہے	۴۷
ہوا سے کرتا ہے کیا کیا مکالمہ جنگل	۴۹
زلزلہ گھر کے اندروں ہی رہا	۵۱
جائز ہے اس کا قتل ہمارے حساب سے	۵۳
روح سلگتی رکھی ہے اور سینہ جلتار کھا ہے	۵۵
کسی نغمے نہ قصے میں مقید	۵۷
وحشت عکس کو اور کیا چاہیے	۵۹
دل دریچے درد دریا دشت و در جھوٹے تمام	۶۱
کیا ہونا باقی ہے اور کیا ہونے کو ہے	۶۳

آواز دے کے خود کو بلانا پڑا مجھے ۶۵

چار دنوں کی بات ہے کم ہو جانے دو طغیانی کو ۶۷

یوں تو اکثر دل بھی دھڑکے چہرے پر ۶۹

یہ بات بھی کیا کم ہے کہ پیروں پہ کھڑا ہوں ۷۱

کوئی دیوار سلامت کوئی در ہو کہ نہ ہو ۷۳

وفا کے باب میں ہرگز گماں نہ رکھا جائے ۷۵

ہوا کے واسطے اک مسئلہ تو میں بھی تھا ۷۷

اک دو جے سے خوش ہیں یا بے زار نہ ظاہر ہونے دیں ۷۹

بے ثباتی پس ثبات کھلی ۸۱

آئنہ عکس نہ لوٹائے اگر ۸۳

ایک سے جذبے خون میں سرخی ایک ہی تھی ۸۵

بھولی ہوئی کہانی میرے نام کرے ۸۷

جس کو ہونا تھا شش جہات میں گم ۸۹

حبس بہتر ہے کہ جب آ کے ہوا جاتی ہے ۹۱

جیسے جیسے میں ہوا غم آشنا ۹۳

میں نہیں تھا رت جگوں میں کون تھا میرے سوا ۹۵

زندگی کرنے میں کرتب کچھ نہیں ۹۷

جذبہ خیر سگالی نکلا ۹۹

وہی مناظر وہی مسافر وہی سدا کا جادہ تھا ۱۰۱

عشق ہی بس محاسبے میں ہے ۱۰۳

نشاط وصل غم ہجر کے مزے سارے ۱۰۵

جب تامل کچھ نہ تھا انکار میں ۱۰۷

ابھی سے دل میں خواہش دید کی ہے ۱۰۹

جب ہر رستہ جانب صحرا جاتا ہے ۱۱۱

لوگ جو آنکھیں بچھا رکھتے ہیں صحرا کی طرف ۱۱۳

یوں تو اک اک لفظ بول اٹھے تری تحریر کا ۱۱۵

وسعتوں کا ہے بھرم گرد سفر کھلنے کا ۱۱۷

جب بھی گل اندام لکھے ۱۱۹

بدلے ہیں کس تیزی سے حالات مرے ۱۲۱

یہ بھی نہیں کہ زیست کبھی دل نشیں نہ تھی ۱۲۳

وہ تو نقش نہ پھر نقاش نے سوچا تیرے جیسا ۱۲۵

کس نے رکھی تھی شہر کی بنیاد ۱۲۷

زندگی کرب فاصلوں کا ہے ۱۲۹

آنکھ سمندر آنسو دریا بن سکتا ہے ۱۳۱

لے وہ کب تیشہء فرہاد صنم ساز میں ہے ۱۳۳

میلے میں کیا رنگینی تھی یہ بھی اس کو یاد نہیں ۱۳۵

یاد آتا ہے حوالوں کی طرح ۱۳۷

کچھ نہیں ماسوا تو سوچنا کیا ۱۳۹

لوگوں کو پھر کم ہی بتلاتے ان کی تقدیر فقیر ۱۴۱

کب ممکن تھا کرب' الم' آزار کی بات نہ لکھتا ۱۴۳

کوئی تو تھا مرے قریں موجود ۱۴۵

جب بھی کوئی زخم پرانا پڑتا ہے ۱۴۷

یوں تو تمھارا ساتھ غزالاں رہا بہت ۱۴۹

اگر ہے حسن بھی حسن نظر تو پھر کیا ہے ۱۵۱

میں وہ قطرہ ہوں جو مٹی کی پوشاک میں رہتا ہے ۱۵۳

فصیل جاں میں دریچہ کوئی عطا کر کے ۱۵۵

سورج عکس' ہوائیں عکس ہیں' مٹی عکس' سمندر عکس ۱۵۷

خوشبو' رنگ' اجالا مجھ پر ختم ہوا ۱۵۹

نصابؔ کا شاعر

جائز ہے اس کا قتل ہمارے حساب سے
جس نے محبتوں کو نکالا نصاب سے

منیر سیفی کا یہ شعر میرے اس کے درمیان تعارف کی پہلی کڑی بنا۔ اور آج جب وہ 'نصاب' کی اشاعت کے بعد واقعی اس بات کا حق دار ہے کہ ہم اسے 'صاحبِ نصاب' شمار کریں' اس لیے کہ وہ محبتوں کے سلسلے میں واقعی بہت غنی ہے اور ایک شاعر کی حیثیت سے ایک مفتی کی شکل میں اس کا یہ فتویٰ بھی درست معلوم ہوتا ہے کہ وہ محبت کے قاتلوں کو بجائے خود واجب القتل سمجھتا ہے۔

ہمارے مکتب' ہمارے مدرسے' ہمارے کالج' ہماری یونی ورسٹیاں اور اسی طرح ہمارے وہ دار العلوم بھی جہاں بطور خاص اسلام' احادیث' قرآن اور فقہ کی تعلیم دی جاتی ہے' کمال افسوس ہے کہ ہر جگہ اہلِ سیاست کسی نہ کسی انداز میں طلبا اور طالبات کو کسی نہ کسی انداز میں Exploit کر رہے ہیں۔ نچلی سطحوں سے مکتبوں میں مخصوص نظریات (جن کی اساس اسلامی اخوت نہیں بلکہ فرقہ واریت پر قائم ہے) سے لے کر' اعلیٰ مدارجِ علمی تک' کوئی

☆ دیباچے کے وقت مجموعے کا مجوزہ نام نصاب تھا (۲۵ اپریل ۱۹۹۴)

اپنے عقیدوں میں رواداری، حسنِ سلوک اور اسلام کی عالم گیر اقدار کا ترجمان نہیں بننا چاہتا

خشتِ اول چوں نہد معمار کج
تا ثریّا می رود دیوار کج

ہر صاحب اختیار اور وطنِ عزیز کا ہر مالکِ اقتدار اس 'بنیادی کجی' کو صرف اپنی سلطنت میں خواہ وہ کتنی ہی محدود ہو یا لامحدود..... اپنی 'کج کلاہی' کے لیے ضروری خیال کرتا ہے۔

شاید دنیا کی کوئی نفرت، اختلاف کی کوئی دیوار، من و تو کا کوئی انتشار، اور مفادات کا کوئی خلفشار، رنگ، نسل، زبان اور عقیدوں کا کوئی افتراق اور ہوسِ مال و زر کا کوئی ایسا غبار نہیں جو حاکموں سے لے کر محکوموں تک، ظالموں سے لے کر مظلوموں تک، امیروں سے لے کر غریبوں تک، دنیا میں باقی نہیں رہا جو ہمارے ملک میں موجود نہ ہو۔ الحمد للہ دنیا کی ہر تقسیم ہمارے یہاں موجود ہے، اور ہم سب ایک اجتماعی خودکشی کی طرف دیوانہ وار ایک عالم وحشت میں مصروفِ سفر ہیں۔ کوئی اپنے ناخن سے، کوئی اپنے قلم سے، کوئی اپنی تلوار سے، کوئی کرسیِ اقتدار سے، جس کا جتنا مقدور ہے، پاکستان کی بقا اور عظمتوں کو بھلا کر ساری قوم کی قبر کھودنے میں مصروف ہے۔ ایسے میں منیر سیفی تہذیب و تمدن کے نمایندہ شہروں کی نام نہاد تہذیب سے بے زار ہو کر ان ہرے بھرے کھیتوں، سبزہ زاروں اور پرسکون دریاؤں کا متلاشی ہے جہاں محبتوں کے گاؤں اور امن و آشتی کے سایے میں خس و خاشاک کے جھونپڑے آباد ہیں۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ منیر سیفی کی شاعری میں شہر کم اور دیہات زیادہ بولتے ہیں۔

وہ بظاہر ایک بینک آفیسر ہونے کے ناتے سوٹ بوٹ میں ملبوس شہری

زندگی کی 'جملہ اخلاقیات' سے غیر مانوس نہیں، لیکن اس کے اندر کا شاعر وارث شاہ اور بلھے شاہ کی دنیا میں جی رہا ہے۔ کسی ندی کے کنارے چھتنار درختوں کے سائے میں۔ وہ کسی ہیر یا کسی سوہنی کے گیت لکھنا چاہتا ہے۔

کبھی کبھی وہ خیال و فکر کی تمام صداقتوں کے ساتھ کسی صوفی یا کسی درویش کی طرح اللہ و رسولؐ کی تلاش میں گم ہو کر، ایک الوہی روشنی میں، پروانہ وار رقص کرنا چاہتا ہے اور اپنے آدرشی مرشدوں کی صحبت میں، خود اپنی مادری زبان پنجابی میں شعر لکھنے کا تجربہ بھی کرتا ہے۔

اس کا جسم شہروں میں اور اس کی روح ان دیہاتوں میں گم ہے جہاں اس کی دھرتی سے ابھرتے ہوئے چشمے اسے ماں کے دودھ کی طرح پاک، شفاف اور آبِ حیات کی طرح مقدس محسوس ہوتے ہیں۔

اسے مشینوں کے دھویں میں غرق شہروں سے وہ گاؤں زیادہ عزیز ہیں جہاں مٹی سے بنے ہوئے سوندھے کوزوں میں سفید کچی لسی تقسیم ہوتی ہے۔ جہاں کنوارے ریشمیں ہات معصومیت کے چرخوں پر، پیار کے گیتوں کا ریشم کاتتے ہیں، اور جہاں مکھن جیسی بانہیں دودھ بلوتی ہیں۔ جہاں ترنجنوں میں چوڑیاں کھنکتی ہیں، جہاں گلابی صبحیں اور سرمئی شامیں رقص کرتی ہیں۔ اور جہاں کاجل آنکھوں سے، دراز زلفوں سے پیار کی گھٹائیں برستی ہیں۔ جہاں چوپالوں میں قہقہے گونجتے ہیں اور جہاں سچے بولوں کے ساگروں سے امرت جھلکتے ہیں۔

اگر وہ ہندو ہوتا تو میں کہتا کہ وہ کوئی 'شو' ہے جو جیون ساگر کا تمام زہر خود پی کر ساری دنیا کو اپنی شاعری کا امرت پلانا چاہتا ہے اور جب وہ اپنی باطنی دنیا سے باہر اپنی خارجی دنیا کے حصار میں داخل ہوتا ہے تو 'جدیدیت' اسے اپنی طرف کھینچتی ہے جہاں وہ کہتا ہے:

مجھ پہ تحقیق دیکھیے کب ہو
سوچ کا کینسر مجھے بھی ہے

پھر اس کی شاعری میں 'پیار کرنسی' جیسی جدید تراکیب بھی آتی ہیں۔ اس کی شاعری بیک وقت کبھی ماضی، کبھی حال اور کبھی مستقبل میں گھوم رہی ہے۔ تو پھر منیر سیفی کیا ہے۔ جدید یا قدیم: رجعت پسند، قدامت پسند یا ترقی پسند اور جدت پسند۔ اس کے باطن میں اس کا بچپن، گاؤں کے ایک سیدھے سادے لڑکے کی طرح آج بھی اس کا ہم سفر ہے۔ اور وہ جدید عہد کی شاعری میں حال و فردا کی تمام تازگی کے ساتھ چاند تک مسافتوں میں بھی شریک ہے اور ان کی کثافتوں سے بے زار بھی۔

منیر سیفی کا یہ شعری سفر اس کے ماضی اور اس کے فردا کے درمیان ایک کشاکش کا سفر ہے۔ شاید وہ اپنی ہی روشنی اور اپنے ہی اندھیروں کی بازگشت ہے۔ شاید وہ ہر سوچنے والے کی طرح "کچھ نہیں ہے" یا شاید "بہت کچھ ہے" جب یہ گم شدگی ختم ہو گی تو شاید وہ اپنے آپ کو تلاش کر لے گا۔ اور جب ایسا ہو گا' اور مجھے یقین ہے کہ ضرور ہو گا' تب لوگ یہ جان لیں گے کہ فکر کو ریاضت اور شعر کو عبادت سمجھنے والا یہ شاعر منیر سیفی آج نصاب لے کر آیا ہے۔ کل سماعتوں کے لیے ایک آواز اور فکری بصارتوں کے لیے مہر و ماہتاب لے کر طلوع ہو گا۔

اہل نظر کو روشنی کی یہ نوید مبارک ہو!

صہبا اختر

مجھ کو حیران، مری آنکھ کو ششدر کر دے
ہر بُنِ مو کو مرے آئنہ منظر کر دے

اوڑھ کر اس کو گزر جاؤں میں ہر برزخ سے
اسم کو اپنے مری روح کی چادر کر دے

صبح اترے تو مجھے شام سے اچھا پائے
میرا فردا، مرے امروز سے بہتر کر دے

ٹوٹ جانے دے بھرم قطرۂ بے مایہ کا
چاہے موتی نہ بنا' سیپ سے باہر کر دے

مشک ایسا ہو کہ ڈھونڈے مجھے آہُوے سخن
اپنی خوشبو سے مرے لفظ معطر کر دے

وصف اک خاص ہے یہ میرے شجر میں سیفی
جس کو سایے میں رکھے اس کو تناور کر دے

پیشِ سرکار دل کی بات گزار
ورنہ دل پر ہی کربِ ذات گزار

آسرا کب تلک سہاروں کا
اپنی درخواست اپنے ہات گزار

روشنی منقطع نہ ہو جائے
جتنی جلدی ہو واجبات گزار

دن کی تاریکیاں دکھاؤں تجھے
ایک دو پہر میرے ساتھ گزار

میں کہاں ہوں، مجھے پتا تو چلے
میری آنکھوں سے کائنات گزار

صبح لا دوں گا آفتاب تجھے
جیسے ممکن ہو آج رات گزار

گم اگر دولتِ اقلیم نہیں ہو سکتی
بادشاہی تری تسلیم نہیں ہو سکتی

۔ایک ہی شخص تھا دنیا سے الگ بے سایہ
روشنی، اب کبھی تجسیم نہیں ہو سکتی

۔ ہات کی رحل پہ جب تک نہ ہو اس کی صورت
ایک آیت کی بھی تفہیم نہیں ہو سکتی

کر تو سکتی ہے وہ تشکیلِ خدا بھی لیکن
آذری کچھ ہو، براہیم نہیں ہو سکتی

جان کر اس کو نہ جانا تو یہ میں نے جانا
وقت سے اب مری تعلیم نہیں ہو سکتی

یہ جو اک شکل مجھے آئنہ دکھلاتا ہے
صورتِ احسنِ تقویم نہیں ہو سکتی

ہٹ گئی ذات مری کیسے مرے بچوں میں
جب اکائی کوئی تقسیم نہیں ہو سکتی

اپنی تقدیر بدلنا ہے مجھے بھی، سیفی
اس کے لکھے میں بھی ترمیم نہیں ہو سکتی

ندی تھا، وہ دریا تھا، سمندر تھا، وہ کیا تھا
کشتی تھا، کنارا تھا، وہ لنگر تھا، وہ کیا تھا

سرشار بھی تھا میں درِ رحمت پہ پہنچ کر
پھر بھی وہ مرے دل میں جو اک ڈر تھا، وہ کیا تھا

آنکھوں سے مری اشک رواں تھے، بھلا کیوں تھے
دامن میں مرے ایک گلِ تر تھا، وہ کیا تھا

خوشبو سی رگ جاں میں جو اتری تھی، وہ کیا تھی
سایہ سا ابھی جو مرے سر پر تھا، وہ کیا تھا

اک پل میں زمیں پر تھا تو اک پل میں فلک پر
انساں تھا، فرشتہ تھا، پیمبر تھا، وہ کیا تھا

وہ جس کے لیے خلق کیا سارے جہاں کو
وہ اپنے قبیلے ہی میں بے گھر تھا، وہ کیا تھا

جب گنگ تھے سب، کون گواہی میں تھا بولا
وہ دست پیمبر میں جو پتھر تھا، وہ کیا تھا

پیوند لگائے ہوئے ملبوس میں، سیفی
تہذیب و تمدن کا وہ محور تھا، وہ کیا تھا

یوں تو کیا کیا لوگ چھپے تھے دروازوں کے پیچھے
میں ہی بس اُڑتا رہتا تھا آوازوں کے پیچھے

خون کا اک قطرہ، ورنہ پھر موت کا نشہ ہوگا
پر ایسی شے کب ہوتی ہے پروازوں کے پیچھے

وہ تو لوگ بنا دیتے ہیں پُراسرار فضا کو
اکثر کوئی راز نہیں ہوتا رازوں کے پیچھے

موسیقار کے بس میں کب ہے لُے کو لَو میں ڈھالے
ایک ان دیکھا ہات بھی ہوتا ہے سازوں کے پیچھے

پھر تو اپنے خون میں تیر کے پار اترنا ہوگا
تلواروں کی فصل ہو جب تیر اندازوں کے پیچھے

تمغا، پنشن، بیوہ، بچے، مایوسی، تنہائی
ایک کہانی رہ جاتی ہے جاں بازوں کے پیچھے

اب تو ہر چوکھٹ پر ماتھا ٹیک رہے ہو، سیفی
اور اگر دیواریں نکلیں دروازوں کے پیچھے

جلا بھی شدّتِ جاں سے بجھا بھی شان سے تھا
وہ اک چراغ جو سورج کے خاندان سے تھا

وہ ایک سوچ کہ آگے تھی ہر تصور سے
وہ ایک لفظ کہ باہر اک اک بیان سے تھا

پھر اس کے بعد سکوں تھا سمندروں پہ محیط
عناد سارا ہواؤں کو بادبان سے تھا

مرے یقین نے اس کو بھی قتل کر ڈالا
وہ اک خیال جو زندہ مرے گمان سے تھا

بلائیں کیسے مرے صحن تک چلی آئیں
ترا مکان تو پہلے مرے مکان سے تھا

کبھی فلک سے اتر کر بھی ہم سے مل لیجے
کبھی ہمارا تعلق بھی آسمان سے تھا

فضا تھی منتظر آغوش وا کیے، پہ منیر
عجیب شخص تھا، سہما ہوا اڑان سے تھا

مجھ پہ جب اپنا انکشاف ہوا
اپنے ہونے پر اختلاف ہوا

تم نے در تو بنا لیا لیکن
وہ جو دیوار میں شگاف ہوا

کیا توقع زمیں سے ہم رکھتے
آسماں ہی جہاں خلاف ہوا

روح محتاج ہے بدن کی خود
جسم بس جسم کا غلاف ہوا

کتنے لوگوں کی گردنیں ماریں
تب کہیں جا کے ہات صاف ہوا

اب وہ حالت ہے شہر کی، سیفیؔ
گھر میں رہنا بھی اعتکاف ہوا

ہواؤں کو اگر ہے تازہ رکھنا
کہیں کھڑکی، کہیں دروازہ رکھنا

چلے ہو جب ان آنکھوں کے سفر پر
زرا گہرائی کا اندازہ رکھنا

بھٹک جانے کی تہمت سے بچو گے
تعاقب میں کوئی آوازہ رکھنا

زمیں سے پاؤں کا رشتہ رہے گا
اک اک خواہش سرِ خمیازہ رکھنا

اب آگے آنسوؤں کا راستہ ہے
نہ چہرہ اب رہینِ غازہ رکھنا

بس اب لوگوں کو راس آنے لگا ہے
سدا بکھرا ہوا شیرازہ رکھنا

زرا مشکل تو ہوگی، پھر بھی، سیفی
فلک کی سمت بھی دروازہ رکھنا

کہاں تک عشق سے انکار ایسے
رہو گے کب تلک نادار ایسے

تحیّر انتہا کی ابتدا ہے
نہیں کھلتے کبھی اسرار ایسے

کٹائی جاتی ہے اس طرح گردن
بچائی جاتی ہے دستار ایسے

کچھ ایسی آ پڑی تھی بات ورنہ
کہاں کے ہم بھی تھے خوددار ایسے

پرندے آسماں کا رخ کریں گے
اگر کٹتے رہے اشجار ایسے

فلک کے واسطے قدغن نہ کوئی
زمیں کے واسطے معیار ایسے

کسی فرعون کو پیچھے لگا لو
اتر جاؤ گے دریا پار ایسے

ہمیں محفوظ کر لو، کل نہ ہوں گے
تمھارے درمیاں کردار ایسے

بس اتنا فرق ہے دونوں میں، سیفی
قلم ایسے ہے اور تلوار ایسے

اور ہوا دیتے ہیں میری بے چینی کو میرے خواب
پھر بھی دیکھا کرتا ہوں میں کیا کیا الٹے سیدھے خواب

لکھ رکھو، ان آنکھوں کی تقدیر میں وحشت لکھی ہے
ہر عالم میں دیکھا کرتی ہیں جو آنکھیں سچے خواب

بے خوابی نے ان پر کیسے کیسے شب خوں مارے ہیں
وہ سوداگر جو بیچا کرتے تھے شام سویرے خواب

اس لڑکی کو گھر سے رخصت کرنے کا سامان کرو
جگنو بن کر چمکیں جس کی آنکھوں میں ان دیکھے خواب

کیسے اجلے لوگ تھے، کیسی روشن باتیں کرتے تھے
نیند سمندر میں ابھرے تھے کیا کیا چاند جزیرے خواب

ہر دم ان کی خیر مناؤں، ان کے دم سے زندہ ہوں
میرا سپنا: میری دھرتی، میرے بچے: میرے خواب

سیفی، اب کیوں تعبیروں سے آنکھ چراتے پھرتے ہو
جیسی جیسی نیندیں بوئیں، ویسے ویسے کاٹے خواب

اونچے نیچے پلڑوں کے بارے میں کیا منہ کھولوں
عشق ترازو دل میں ہو جائے تو خود کو تولوں

پھر یہ چاہوں روشنی اور ہوا سے گھر بھر جائے
اندر کھلنے والے دروازے کو باہر کھولوں

آنکھ سراب کے آئینے سے کچھ تو دھند چھٹے گی
دریا دریا سوکھ چکا ہوں، صحرا صحرا رو لوں

ٹوٹ گیا تو پیڑ کی صورت خود پر آن گروں گا
جب آندھی کو روک نہیں سکتا تو ساتھ ہی ہولوں

دھرتی اپنی چادر مجھ پر جب ڈالے تب ڈالے
ماں کی گود میں سر رکھ کر میں تھوڑی دیر تو سولوں

بچے خوابوں کو ترسے تو ایک قیامت ہوگی
کچھ نیندیں، کچھ نغمے آنے والے کل میں بولوں

قریہ قریہ چھان چکا جب قطرہ قطرہ بارش کا
آخر ایک سمندر تھا جو مسکن ٹھہرا بارش کا

سورج نے ان آنکھوں کو بھی کیا کیا زخم لگائے ہیں
سوتے جاگتے دیکھا کرتی تھیں جو سپنا بارش کا

کونپل کونپل ناچ رہی ہے' پتے شور مچاتے ہیں
آنگن آنگن کھیل رہا ہے بچہ بچہ بارش کا

کس کس کی میں پیاس بجھاؤں کس کس کے کام آؤں میں
سوچ رہا ہے جانے کیا کیا پہلا قطرہ بارش کا

یوں تو یہ بادل کے پنکھ لگا کر اڑتی رہتی ہے
دھرتی سے قائم رہتا ہے پھر بھی رشتہ بارش کا

تم کیا جانو، ہجر میں کیسے کیسے آنسو بہتے ہیں
تم کیا سمجھو، کیا ہوتا ہے دل پہ اترنا بارش کا

اس کے بعد دھنک کے سارے رنگ کروں گا قید، منیر
پہلے گھر آنگن میں بٹھلا تو لوں پہرا بارش کا

کتنا ترسا ہوں میں اس انجمن آرائی کو
وصل کے مول نہ بیچوں کبھی تنہائی کو

آئنہ باقی رہا پھر، نہ کوئی عکس نہ میں
جب اکائی سے چلا وصل کی یکتائی کو

ہم کہ آنکھوں میں اترنے کا ہنر جانتے ہیں
سطح سے بھانپ لیا کرتے ہیں گہرائی کو

کیا خبر تھی کہ ہے باقی ابھی سورج کا سفر
ہم تو شب خوں سے بچا لائے تھے بینائی کو

اے خدا! ایک اداسی کو سلامت رکھنا
گھر میں کوئی تو ہو موجود پذیرائی کو

جتنا کمزور ہو دشمن اسی نسبت سے، منیر
راستہ چھوڑ دیا کرتے ہیں پسپائی کو

در و دیوار کسی اور کے گھر میرا ہے
اب بھی میں زندہ اگر ہوں تو ہنر میرا ہے

اور بڑھ جائے گا قامت میں مرا پیکرِ گِل
جس کو سولی سے ڈراتے ہو وہ سر میرا ہے

وہ جو واپس نہیں آیا وہ لہو میرا تھا
یہ جو افلاک سے لوٹا ہے یہ پر میرا ہے

میرے سایے سے چھڑا دے مرا پیچھا اب تو
روشنی تیری طرف کب سے سفر میرا ہے

میں نے سو رنگ میں لکھا ہے ترا اسمِ جمیل
حرف تیرے ہی سہی، حرف میں زر میرا ہے

ہات پھیلے نہ کبھی ان کا بجز پیش خدا
میرے بچوں پہ ابھی اتنا اثر میرا ہے

میری پہچان، مری اپنی زمیں ہے، سیفی
یوں تو افلاک سے آگے بھی گزر میرا ہے

لہو کا ذائقہ ہی جب زبان تک نہ گیا
تو کیا عجب ہے جو زخموں پہ دھیان تک نہ گیا

وہ ایک وہم جو سرمایۂ فقیری تھا
یقیں میں اس طرح بدلا گمان تک نہ گیا

بدل گئی کہیں رستے میں کیمیا اس کی
اٹھا غبار مگر آسمان تک نہ گیا

انا پرست تھے ایسے، بدن تو پھر ہے بدن
ہمارا سایہ کبھی سائبان تک نہ گیا

بتا کے رہ گئے سب داؤ پیچ ساحل سے
ہوا کے ساتھ کوئی بادبان تک نہ گیا

جواب دیتے بھی کیا منکر و نکیر کو ہم
ہمارے ساتھ کوئی ترجمان تک نہ گیا

خدا کا شکر کہ میرے ہی جرم کافی تھے
فقیہِ شہر مرے خاندان تک نہ گیا

ہمارے تیر چھپائے نہیں گئے تھے منیرؔ
ہمارا ہات ہی اپنی کمان تک نہ گیا

خوفِ تخریب و شر مجھے بھی ہے
اپنے ہونے کا ڈر مجھے بھی ہے

تم بھی جاگے ہوئے ہو صدیوں کے
جاگنا رات بھر مجھے بھی ہے

تم بھی مصروف ہو خدائی میں
اور کارِ دگر مجھے بھی ہے

یہ الگ بات میں نہ منھ کھولوں
تم کہاں ہو خبر مجھے بھی ہے

فائدہ کیا ہے اس کے ہونے کا
سوچنا ہی اگر مجھے بھی ہے

موت سے ساز باز کر لے گی
زندگی سے خطر مجھے بھی ہے

مجھ پہ تحقیق دیکھیے کب ہو
سوچ کا کینسر مجھے بھی ہے

اڑنا آتا نہیں مگر، سیفیؔ
خواہشِ بال و پر مجھے بھی ہے

ہوا سے کرتا تھا کیا کیا مکالمہ جنگل
ہوا جو حبس تو چپ چاپ مر گیا جنگل

نہ روشنی کا گزر ہے، نہ ہے خرام صبا
فصیلِ شہر پہ کس نے اگا دیا جنگل

پرند ہی کڑے موسم کی تاب لا نہ سکے
پھرے نہ کر کے کسی سے معاہدہ جنگل

- بس اک تبسمِ گل سے چھک اٹھا صحرا
بس اک غزال کے رم سے مہک اٹھا جنگل

خرد کی اس طرح تہذیب مدرسوں میں نہ ہو
جنوں پہ جیسے چڑھاتے ہیں حاشیہ جنگل

خراج دے کے انہیں ٹالنے کی بات کرو
اٹھائیں گے نہ کبھی اب محاصرہ جنگل

وہ دھوپ ہو گی کہ جل جائیں گی زمیں کی رگیں
جو تو منیرؔ یوں ہی کاٹتا رہا جنگل

زلزلہ گھر کے اندروں ہی رہا
میں کھڑا صورتِ ستوں ہی رہا

شرمسار اُس قیام میں بھی ہوئے
یہ سفر بھی ہمارا یوں ہی رہا

ہو گئی ختم چلتے چلتے زمیں
فاصلہ اُس سے جوں کا توں ہی رہا

کیسے کیسے ستارے ٹوٹ گئے
آسماں پھر بھی نیلگوں ہی رہا

انقلاب آئے کیسے کیسے مگر
جو نگوں تھا وہ سرنگوں ہی رہا

خاک روتا لہو میں عشق میں جب
آنکھ باقی رہی نہ خوں ہی رہا

آسماں بھی جنوں کی زد پر تھے
صاحبِ فرش بھی جنوں ہی رہا

جائز ہے اس کا قتل ہمارے حساب سے
جس نے محبتوں کو نکالا نصاب سے

تنقید کر رہے ہیں کتابِ حیات پر
آگے نہ بڑھ سکے جو کبھی انتساب سے

میں صاحبِ خبر بھی، نظر بھی، جنوں بھی تھا
جب تک رہا تھا میرا تعلق کتاب سے

اُس وقت ایک سجدہ بڑے کام آ گیا
میں جب گزر رہا تھا انا کے عذاب سے

اک لمحے کا فراق ہوائیں نہ سہ سکیں
دریا کہ شرمسار رہے گا حباب سے

مجھ سے بڑے بڑے تھے گنہ گار اس جگہ
بے کار ڈر رہا تھا میں یومِ حساب سے

کانٹوں کے خوف سے بھی لرزتے ہو تم منیر
اور گھر بھی چاہتے ہو سجانا گلاب سے

روح سلگتی رکھی ہے اور سینہ جلتا رکھا ہے
اس نے مجھ کو لاکھوں انسانوں سے اچھا رکھا ہے

تم روشن کر رکھو جتنے ہجر الاؤ ممکن ہوں
میں نے بھی اپنی آنکھوں کے پیچھے دریا رکھا ہے

آنکھ کہاں ہے ایک آفت گویا رکھی ہے چہرے پر
دل کب ہے میرے پہلو میں، ایک تماشا رکھا ہے

جو مجھ میں کھل کر ہنستا اور ساون بھادوں روتا تھا
اس بچے کو اب تک میں نے خود میں زندہ رکھا ہے

جس دن میری دھرتی اپنی چادر مجھ پر ڈالے گی
بس اس دن کی خاطر میں نے خود کو زندہ رکھا ہے

خاک بسر پھرتی ہیں جس میں لیلائیں دن رات منیرؔ
میں نے اپنی ذات میں ایک ایسا بھی صحرا رکھا ہے

کسی نغمے نہ قصے میں مقیّد
مجھے کر دیں گے کتبے میں مقیّد

کتابیں، تتلیاں، پَر، پھول، پتے
مرا بچپن ہے بستے میں مقید

مرے چہرے پہ ٹھیراؤ نہ دیکھو
تمنائیں ہیں سینے میں مقید

سمندر کیا مری وسعت کو جانے
سمندر خود ہے قطرے میں مقید

کبھی مٹھی میں ہیں سارے زمانے
کبھی میں ایک لمحے میں مقید

کبھی آزاد ہوں قید قفس میں
کبھی ہوں آشیانے میں مقید

اسی میں قید سارے دائرے ہیں
وہ نکتہ جو ہے نقطے میں مقید

تو پھر لیلیٰ ہی کیوں کر کھو گئی ہے
اگر صحرا ہے، ذرے میں مقید

گلی سنسان ہے لیکن وہ، سیفیؔ
ابھی تک ہے دریچے میں مقید

وحشتِ عکس کو اور کیا چاہیے
ایک پتھر سرِ آئنہ چاہیے

خواہشوں کا بھی ہے اک عجب سلسلہ
کھڑکیاں کھل گئیں تو ہوا چاہیے

جو بھی شے دور سے خوب صورت لگے
اس کو نزدیک سے دیکھنا چاہیے

جس کا مرکز مرے قلب کا وسط ہو
میری حیرت کو وہ دائرہ چاہیے

تا کنیزیں مشرف بہ ایمان ہوں
شاہزادوں کو اب تخلیہ چاہیے

چاہے چشمِ زلیخا کی صورت میں ہو
حسنِ یوسف کو بھی آئنہ چاہیے

موت سارے مسائل کا حل ہی سہی
خود کشی کے لیے حوصلہ چاہیے

دل دریچے، درد دریا، دشت و در جھوٹے تمام
اک زرا ٹھوکر لگی اور آئنے ٹوٹے تمام

اب تو ساحل کو پلٹ جا اے ہوائے جاں گسل
پانیوں پر جس قدر تھے بلبلے پھوٹے تمام

فکر آیندہ بھی تھی، ماضی کے پچھتاوے بھی تھے
یوں تو ہم نے زندگانی کے مزے لوٹے تمام

پار اترتی تھیں جنھیں لے کر بغل میں سوہنیاں
یا تو اب بنتے نہیں یا وہ گھڑے ٹوٹے تمام

کہنہ سالی میں تو عادت اور پختہ ہو گئی
ہم سمجھتے تھے جوانی کے چلن چھوٹے تمام

کوئی موسم ہو ہمارے گھر میں رہتی ہے بہار
ہم نے دیواروں پہ بنوائے ہیں گل بوٹے تمام

کیا ہونا باقی ہے اور کیا ہونے کو ہے
یوں لگتا ہے شہر کا سودا ہونے کو ہے

لوگ اپنی پہچان بتانے سے ڈرتے ہیں
خوف سے ہر چہرہ بے چہرہ ہونے کو ہے

کل ہم آنگن کے بٹ جانے پر روئے تھے
اور اب دھوپ کا بھی بٹوارہ ہونے کو ہے

پھر بھی کیسے کیسے دائرے بُنتا ہوں میں
یوں تو میری ذات اک نقطہ ہونے کو ہے

لاکھوں سورج شب کی کوکھ سے پیدا ہوں گے
شام ہوئی ہے، درد سویرا ہونے کو ہے

چاند پہ جتنا سوت تھا بڑھیا کات چکی ہے
کچھ ہی دن میں چاند برہنہ ہونے کو ہے

میں بھی ہمت ہارنے ہی والا ہوں، سیفی
دشمن کا لشکر بھی پسپا ہونے کو ہے

آواز دے کے خود کو بلانا پڑا مجھے
اپنی مدد کو آپ ہی آنا پڑا مجھے

مجھ سے تمھارے عکس کو کرتا تھا بد گماں
آئینہ درمیاں سے ہٹانا پڑا مجھے

پھر اس کے بعد جرأتِ گریہ نہیں ہوئی
اک اشک خاک سے جو اٹھانا پڑا مجھے

پھر یوں ہوا کہ جھوٹ کی عادت سی ہو گئی
پھر یوں ہوا کہ سچ کو چھپانا پڑا مجھے

پانی قبول ہی نہیں کرتا تھا میری لاش
دریا کو اپنا نام بتانا پڑا مجھے

- مہمان آ گیا تھا' سو کھانے کی میز پر
جلتا ہوا چراغ بجھانا پڑا مجھے

دھرتی کے ظرف کا ہوا اندازہ جب' منیر
کچھ روز اپنا بوجھ اٹھانا پڑا مجھے

چار دنوں کی بات ہے، کم ہو جانے دو طغیانی کو
مٹی خود ہی بانٹ کے رکھ دے گی دریا کے پانی کو

قوسوں اور خطوں میں کیوں مجھ کو الجھایا جاتا ہے
اک نقطہ ہی جب کافی ہو سکتا تھا حیرانی کو

پھر نقشِ اول بُن دیتا ہے آنکھوں میں خواب کوئی
سوچتے سوچتے تھک جاتا ہوں میں جب نقشِ ثانی کو

سرافرازی، یا تو سر نیزوں پر چڑھ کر پاتے ہیں
یا سجدے میں گر کر عظمت ملتی ہے پیشانی کو

مجھ میں رہنے والا بچہ مجھ پر ہنستا رہتا ہے
کب تک میرے ساتھ رہو گے تم میری نگرانی کو

یادیں، پھول، کتابیں، خط، تصویریں، خوشبو، تنہائی
تم نے کیا کیا رونق بخشی ہے گھر کی ویرانی کو

سیفی، ایسی قید سے اس کا مر جانا ہی بہتر ہے
سورج بھی جس قید میں روٹی لگتا ہے زندانی کو

یوں تو اکثر دل بھی دھڑکے چہرے پر
جو کچھ ہیں، آنکھیں ہیں میرے چہرے پر

پڑھنے والی آنکھ وظیفہ کرتی ہے
لکھ دیتا ہے پیار صحیفے چہرے پر

میرے چہرے پر لکھا ہے نام مرا
اور تری تصویر ہے تیرے چہرے پر

شام سے پہلے رات اترنے لگتی ہے
ہنس دیتے ہیں جب آئینے چہرے پر

پہلے میری آنکھوں کو زنجیر کیا
پھر کھولے ساتوں دروازے چہرے پر

تیرے غم نے ہر عالم پہچان لیا
میں نے کیا کیا چہرے اوڑھے چہرے پر

سال گزر جاتے ہیں عشق میں اور، منیر
تھم کر رہ جاتے ہیں لمحے چہرے پر

یہ بات بھی کیا کم ہے کہ پیروں پہ کھڑا ہوں
دیکھو تو ذرا کتنی بلندی سے گرا ہوں

پردے میں تری ذات بھی اس دن نہ رہے گی
جس دن یہ پتا چل گیا، میں کون ہوں، کیا ہوں

خوشبو پہ مری شعر لکھے جائیں گے برسوں
فی الحال میں کانٹوں کی صلیبوں پہ کھڑا ہوں

کیا اس سے بڑا اور کوئی سانحہ ہوگا
جینے کے لیے اپنا لہو بیچ رہا ہوں

جو بات بھلانا تھی وہی یاد رہی ہے
رکھنا تھا جسے یاد اسے بھول گیا ہوں

کیا خوفِ عقوبت ہو مجھے حشر میں، سیفی
جب دہر میں جینے کی سزا کاٹ رہا ہوں

کوئی دیوار سلامت، کوئی در ہو کہ نہ ہو
ہم جہاں چھوڑ گئے تھے وہاں گھر ہو کہ نہ ہو

ایک لمحہ بھی تو ہوتا ہے بہت، دستِ ہنر!
پھر کشیدہ مرے قامت پہ یہ سر ہو کہ نہ ہو

گھر سے جب آ ہی گئے ہیں تو پلٹنا کیسا
راستہ ہو کہ نہ ہو، رختِ سفر ہو کہ نہ ہو

پھر کوئی پیڑ نہ سایہ مجھے لوری دے گا
پھر مرے پاؤں تلے راہ گزر ہو کہ نہ ہو

جب مجھے خاک ہی ہونا ہے تو حسرت کیسی
گریۂ چشمِ گل و شعلۂ تر ہو کہ نہ ہو

پھر کسی روپ میں آ جاؤں گا تجھ سے ملنے
میں تو ہر شکل میں ہوں، شکل مگر ہو کہ نہ ہو

عکس میں نے جو پسِ آب چھپا رکھے ہیں
تم کو بھی شیشہ گرو! ان کی خبر ہو کہ نہ ہو

راستے بند نہ کر چاند اترنے کے منیر
آئنہ ہونا ضروری ہے، نظر ہو کہ نہ ہو

وفا کے باب میں ہرگز گماں نہ رکھا جائے
وگرنہ دل میں کوئی میہماں نہ رکھا جائے

محبتوں میں کسی دوست کا بھی دخل نہ ہو
محبتوں میں کوئی رازداں نہ رکھا جائے

چلو تو ایسے کہ دھرتی کو بھی پتا نہ چلے
غبار کوئی پسِ کارواں نہ رکھا جائے

رکھا ہی جائے اگر دشتِ بے اماں میں قدم
خیال و خطرۂ سود و زیاں نہ رکھا جائے

یہ لامکاں بھی تو آخر کسی مکاں میں ہے
مکاں دکھا کے مجھے بے مکاں نہ رکھا جائے

بس ایک دن سہی ایسا ہو جب پرندوں کو
تلاشِ رزق میں یوں سر گراں نہ رکھا جائے

زمیں تو اپنی حقیقت ہی بھول جائے منیر
زمیں کے سر پہ اگر آسماں نہ رکھا جائے

ہوا کے واسطے اک مسئلہ تو میں بھی تھا
دیا، دیا سہی، شب بھر جلا تو میں بھی تھا

ثبوت لانا کٹھن تھا 'الٰہ' کا یوں بھی
دلیل جس کی میں خود تھا وہ 'لا' تو میں بھی تھا

مرے وجود میں گم تھے تحیّرات کئی
خلا میں ڈھونڈتا کیا میں، خلا تو میں بھی تھا

بھٹک رہا تھا "نہیں" اور "ہاں" کے بیچ کہیں
خود اپنے ہات میں اک مشغلہ تو میں بھی تھا

۔ یہ اور بات اب اپنا سراغ ڈھونڈتا ہوں
تمھاری سمت کوئی دن چلا تو میں بھی تھا

❁

اک دوجے سے خوش ہیں یا بے زار نہ ظاہر ہونے دیں
لطف تو جب ہے چہرے سے آثار نہ ظاہر ہونے دیں

کل جو ہو گزرا ہے اس پر کیسے کیسے مضموں ہیں
کل جو ہونے والا ہے اخبار نہ ظاہر ہونے دیں

اپنے فن میں یکتا ہیں فنکار سبھی اس ناٹک کے
آخری سین تلک اپنا کردار نہ ظاہر ہونے دیں

تصویریں کیا بتلائیں گی، دریا کتنا گہرا ہے
تصویریں تو پانی کی رفتار نہ ظاہر ہونے دیں

پھر ان کا پیتل بھی سونا، کانچ بھی ہیروں جیسا ہے
اپنی ناداری کو گر نادار نہ ظاہر ہونے دیں

کیا ہو؟ ساتوں رنگ اگر مل کر بے رنگے ہو جائیں
کیا ہو؟ پھول اگر اپنی مہکار نہ ظاہر ہونے دیں

ان شاعر لوگوں کی کمزوری ہے حُسن جہاں بھی ہو
لیکن کیا عیاری ہے، معیار نہ ظاہر ہونے دیں

بے ثباتی پسِ ثبات کھلی
بسترِ مرگ پر حیات کھلی

میرے ہونے سے کھل نہ سکتی تھی
جو نہ ہونے سے میرے بات کھلی

ماہتابوں کے درمیان تھا میں
رات، کچھ ایسے مجھ پہ رات کھلی

پھر حیا تھی نہ زیبِ تن تھی قبا
چاندنی جب ہوا کے ساتھ کھلی

منتظر جیسے ایک لمس کی تھی
پھر تو وہ زلف ہاتوں ہات کھلی

بج اٹھا ایک ایک تارِ بدن
ہات بھیگے تو بات بات کھلی

روز روشن میں تارے گنتا ہوں
کر گیا کوئی واردات کھلی

کتنے دروازے مجھ پہ بند ہوئے
شہر میں جب بھی کی ہے بات کھلی

کھل گیا عکس عکس چہرہ، منیر
آئنے پر نہ میری ذات کھلی

آئنہ عکس نہ لوٹائے اگر
میری پہچان ہی کھو جائے اگر

آسمانوں سے نہ پانی برسے
اور دریا بھی اتر جائے اگر

ہم سمندر سے بھی پیاسے لوٹیں
اس پہ شبنم بھی نہ ہات آئے اگر

سورج آ جائے سوا نیزے پر
اور پیڑوں کے نہ ہوں سایے اگر

جس کی خاطر یہ سفر ہیں جاری
راستہ وہ بھی نہ دکھلائے اگر

قید میں ڈال دوں سارے سایے
روشنی مجھ کو نظر آئے اگر

کسی دیہات کا رخ کرنا منیر
دل ترا شہر میں گھبرائے اگر

✿

ایک سے جذبے' خون میں سرخی ایک ہی تھی
دیس جدا تھے' پیار کرنسی ایک ہی تھی

اس پر بھی بس لیلیٰ لیلیٰ لکھا تھا
اس کے پاس اگرچہ تختی ایک ہی تھی

گھڑے بنانا چھوڑ دیے کمہاروں نے
گاؤں میں ڈوبنے والی لڑکی ایک ہی تھی

حصہ بخرے بانٹ لیے ہیں لوگوں نے
بے چارے کیا کرتے دھرتی ایک ہی تھی

پھر کوئی طوفان نہ آیا، ٹھیک ہوا
ورنہ نوح کے پاس بھی کشتی ایک ہی تھی

- اس کے بعد سراب تھا یا ویرانے تھے
سات زمینوں پر بھی بستی ایک ہی تھی

اپنے سامنے میں خود ہی صف آرا تھا
اور مری بندوق میں گولی ایک ہی تھی

بھولی ہوئی کہانی میرے نام کرے
بچپن ایک جوانی میرے نام کرے

جب چاہے طغیانی میرے نام کرے
دریا سارا پانی میرے نام کرے

مر جاؤں یا عشق کو ششدر کر جاؤں
حسن اگر حیرانی میرے نام کرے

پہلے ریت پہ اپنا نام لکھے اور پھر
صحرا کی نگرانی میرے نام کرے

ہونٹوں کی خوشبویں مجھ کو سونپی تھیں
آنکھوں کی ویرانی میرے نام کرے

اپنے سارے سُکھ اس سے منسوب کروں
جو ہر پیڑ پرانی میرے نام کرے

اس سے بڑھ کر اور وہ کیا کر سکتا ہے
اپنا آپ، زبانی میرے نام کرے

جس کو ہونا تھا شش جہات میں گم
ہو گیا وہ بھی اپنی ذات میں گم

ہم "فیکوں" ہیں ہم ہی گم ہوں گے
"کُن" نہیں ہوگا کائنات میں گم

خیر و شر کا حساب کیا رکھے
آدمی اتنی مشکلات میں گم

ایک پنچھی فضا میں اڑتا ہوا
ایک نقطہ تحیّرات میں گم

آئنے کی تلاش چہرے کو
آئنہ خود تجلّیات میں گم

اس کی باتوں کو معتبر جانیں
وہ جو ہو جائے بات بات میں گم

پیاس زمزم کشید کرتی ہے
پیاس ہوتی نہیں فرات میں گم

زندگی ٹوٹ ٹوٹ جائے، منیرؔ
دن اگر ہو نہ جائے رات میں گم

حبس بہتر ہے کہ جب آ کے ہوا جاتی ہے
در و دیوار سبھی گھر کے ہلا جاتی ہے

وصل کی جوت کہ لو ہو رخِ تنہائی کی
حد سے بڑھ جائے تو پھر آنکھ کو کھا جاتی ہے

آسماں دور نہیں مجھ سے تو پھر دیکھتا ہوں
درد جاتا ہے کہ اب پہلے دعا جاتی ہے

کسی صحرا کی اداسی، کوئی پت جھڑ کی ہوا
شام ہوتے ہی مری سانس میں آ جاتی ہے

۔ لوٹ کر جاتے ہوئے دیکھا نہیں آج تلک
موج کیسی بھی ہو، ساحل میں سما جاتی ہے

۔ ورنہ ہر آنکھ، ہر اک قلب ہو پتھر جیسا
تیری صورت ہے جو آئینہ بنا جاتی ہے

زخم بجھ جائے کبھی، کب ہے یہ ممکن، سیفی
یہ دیا وہ ہے، ہوا جس کو جلا جاتی ہے

جیسے جیسے میں ہوا غم آشنا
ویسے ویسے ہو گئے کم آشنا

کون سی منزل تھی وہ عرفان کی
صرف گوتم ہی تھا گوتم آشنا

اپنی اپنی ذات میں سب قید ہیں
ناشناسا ہیں ابھی ہم آشنا

مندمل وہ ہو نہیں سکتے کبھی
زخم ہوتے ہیں جو مرہم آشنا

اک زرا سی دھوپ میں مرجھا گئے
کس قدر تھے پھول شبنم آشنا

ہو گئی ہیں خواب وہ زلفیں مگر
انگلیاں اب بھی ہیں ریشم آشنا

ہو گئے ہوتے وہ ممنونِ فرات
پاؤں ہوتے گر نہ زمزم آشنا

گھر کی دیواروں سے غافل تھا، منیر
اور بنا پھرتا تھا عالم آشنا

میں نہیں تھا، رت جگوں میں کون تھا میرے سوا
ساتھ میرے وحشتوں میں کون تھا میرے سوا

اک زمانے میں ہوا کرتا ہے گوتم ایک ہی
دوسرا پھر جنگلوں میں کون تھا میرے سوا

ہات وہ کس کے تھے جو میرے گلے تک آ گئے
میرے جیسا دوستوں میں کون تھا میرے سوا

تم تو خود اپنی تجلی ہی میں تھے کھوئے ہوئے
عکس در عکس آئنوں میں کون تھا میرے سوا

کس نے میرے نام پر اپنی سیاہی پھیر دی
مجھ سے پہلے مدرسوں میں کون تھا میرے سوا

کون اکساتا رہا تھا شعر گوئی پر مجھے
موجزن میری رگوں میں کون تھا میرے سوا

پاس آتے موسموں میں کون تھا محوِ خرام
دور ہوتی آہٹوں میں کون تھا میرے سوا

میں تو لب بستہ تھا پھر وہ چیخ کیسی تھی منیرؔ
رات میری ٹھوکروں میں کون تھا میرے سوا

زندگی کرنے میں کرتب کچھ نہیں
اب تلک تھا میں، مگر اب کچھ نہیں

کون سی مد میں ہمارا نام ہے
ماسوا تیرے، یہاں جب کچھ نہیں

جتنے مذہب ہیں، زمیں والوں کے ہیں
آسماں والوں کا مذہب کچھ نہیں

لمحۂ موجود سے باہر نکل
لمحۂ موجود ہی سب کچھ نہیں

آ گئے ہم کیوں، منیرؔ اس شہر میں
اس جگہ شاعر کا منصب کچھ نہیں

جذبۂ خیر سگالی نکلا
دل سے اک اور موالی نکلا

حُسن تیرا بھی ہے خوابِ پیہم
عشق میرا بھی خیالی نکلا

کام آتا بھی تو سجدہ کیسے
دل ہی جب درد سے خالی نکلا

بڑھ گئی اور زمیں کی وسعت
گھر سے جب کوئی سوالی نکلا

- بے مثال ایک ہی ہستی ٹھہری
ایک ہی شخص مثالی نکلا

وہی مناظر، وہی مسافر، وہی سدا کا جادہ تھا
جب افتاد پڑی تھی، مجھ سے میں ہی دُور افتادہ تھا

ایک امید و بیم کے عالم میں بستی دم سادھے تھی
اور ہوا کے تیور تھے، پانی کا اور ارادہ تھا

سورج بھی پہنے تھے میں نے اور تارے بھی اوڑھے تھے
دن میں اور مرا پیراہن، شب میں اور لبادہ تھا

- اس نے مجھ کو دریا کر ڈالا' یہ اس کی عظمت ہے
میں تو قطرے کی صورت بھی رہنے پر آمادہ تھا

گٹھڑی سر سے کیا اتری میں اپنی چال ہی بھول گیا
تن کر چلتا تھا میں جب تک سر پر بوجھ زیادہ تھا

پھر اک روز مرا بیٹا میری مسند پر آ بیٹھا
جب تک میری ماں زندہ تھی' میں گھر میں شہزادہ تھا

اب' سیفی کی باتوں میں وہ پہلے جیسی بات کہاں
شہر میں آنے سے پہلے یہ شخص نہایت سادہ تھا

عشق ہی بس محاسبے میں ہے
حسن تو سب کے رابطے میں ہے

سوچنا بھی محال ہے جس کا
نقش وہ بھی مشاہدے میں ہے

ایک نقطے میں کائنات تمام
اک صدی ایک ثانیے میں ہے

اپنے اطراف سے نہ باہر ہو
دائرہ وہ جو دائرے میں ہے

تیرگی ختم کیوں نہیں ہوتی!
یہ اندھیرا سا کیا دیے میں ہے؟

خواہشیں شاہ زادیوں جیسی
گفتگو ساری تخلیے میں ہے

اب تو سجدے سے سر اٹھا لیجے
اب جہانگیر مقبرے میں ہے

کیا ہوئے، سیفیؔ، شہر کے بچے
ایک سناٹا مدرسے میں ہے

نشاطِ وصل، غمِ ہجر کے مزے سارے
چکھے تھے ایک ہی لمحے میں ذائقے سارے

بہت دنوں سے کوئی فون بھی نہیں آیا
بہت دنوں سے معطل ہیں رابطے سارے

بس ایک پہلا قدم ہی محال تھا ورنہ
ہمارے شہر کو آتے تھے راستے سارے

عجیب شخص تھا سویا نہ عمر بھر وہ بھی
منائے جس کے لیے میں نے رتجگے سارے

وہ ایک عکس کسی جسم کی تلاش میں ہے
اس ایک عکس کے پیچھے ہیں آئنے سارے

فصیلِ شہر کو یہ لوگ خود گرا دیں گے
اگر اٹھا لیے میں نے محاصرے سارے

عداوتوں کے لیے کوئی بھی اصول نہیں
محبتوں کے لیے ہیں یہ ضابطے سارے

جب تامّل کچھ نہ تھا انکار میں
پھر تذبذب کس لیے اقرار میں

سارا پھیلاؤ فقط نقطے میں ہے
دائرہ ہوتا نہیں پرکار میں

آنکھ پتھر ہو گئی دہلیز پر
زلزلے دھڑکا کیے دیوار میں

شہر میں تاریکیاں بڑھتی رہیں
سرخیاں لگتی رہیں اخبار میں

پاؤں میں جوتے نہیں ہوتے کہیں
سر نہیں ہوتا کہیں دستار میں

میرے سر پر بھی انا کی دھوپ تھی
آپ بھی تھے سایۂ پندار میں

دیکھتے ہیں کس کی کیا قیمت لگے
آیئے دونوں چلیں بازار میں

سونے والے پائیں تعبیریں، منیرؔ
خواب اتریں دیدۂ بیدار میں

ابھی سے دل میں خواہش دید کی ہے
ابھی تو عشق کی تمہید کی ہے

تم ان سے مل کے آئے ہو، بتاؤ
مرے بارے میں کیا تاکید کی ہے

محبت میں امام آیا، جو آیا
کسی نے کب یہاں تقلید کی ہے

مرا دل ضوفشاں ہے اس سے آگے
جہاں تک سلطنت خورشید کی ہے

مذاق اس نے اڑلیا ہے خود اپنا
کہ اس نے عہد کی تجدید کی ہے

یہ بچہ، نسلِ آیندہ کا آدم
یہی بس اک کرن امید کی ہے

- جب ہر رستہ جانبِ صحرا جاتا ہے
پھر کیوں شہر میں جنگل پھیلا جاتا ہے

پہلے وعدہ کرتا ہے لوٹ آنے کا
پھر دیوار سے باہر سایہ جاتا ہے

سورج کو دیکھوں تو آنکھیں جاتی ہیں
تاریکی کر دوں تو شیشہ جاتا ہے

بند رکھوں گر آنکھیں اندھا ہوتا ہوں
اور آنکھیں کھولوں تو سپنا جاتا ہے

بند نہیں باندھا تو بستی ڈوبے گی
بند بناتا ہوں تو دریا جاتا ہے

آئینہ ہر دور میں چکنا چور ہوا
پتھر کو ہر دور میں پوجا جاتا ہے

پھر گندم کی گود سے چاند نہ کیوں ابھرے
گندم کو چکی میں پیسا جاتا ہے

رہنے والے بعد میں دیکھے جاتے ہیں
پہلے گھر کا نقشہ دیکھا جاتا ہے

سیفیؔ، عشق وہ نغمہ ہے جو آنکھوں سے
خاموشی کے تال پہ گایا جاتا ہے

۔ لوگ جو آنکھیں بچھار کھتے ہیں صحرا کی طرف
لوٹ کر دیکھا نہیں کرتے وہ دنیا کی طرف

پھر کناروں پر جو گزرے گی، کسے معلوم ہے
رخ سمندر نے کبھی پلٹا جو دریا کی طرف

در سماعت کے کھلے رکھنا ضروری ہی سہی
دیکھتے رہنا ہے لازم حرفِ گویا کی طرف

اپنا سایہ بھی اسے آسیب کی صورت لگا
وہ ہوا کی یورشیں تھیں نخلِ تنہا کی طرف

نوجوانوں میں عقابی آنکھ کے تھے تذکرے
جتنے بچے تھے وہ سب کے سب تھے چڑیا کی طرف

باپ کے چہرے کو جب دیکھا دھواں ہوتے ہوئے
ہاتھ اٹھے رہ گئے بچی کے، گڑیا کی طرف

اور کچھ دن رک گیا ہوتا اگر دستِ طلب
دامنِ یوسف کو آنا تھا زلیخا کی طرف

دو قدم آگے نکل آئے تھے جب "لا" سے منیرؔ
پھر کہاں ممکن رہا تھا لوٹنا "لا" کی طرف

یوں تو اک اک لفظ بول اٹھے تری تحریر کا
دل مگر احسان مانگے لذتِ تقریر کا

ہم گنہ گاروں سے بڑھ کر پارسا ہوگا کوئی
جرم بھی کرتے ہیں اور دھڑکا بھی ہے تعزیر کا

لاکھ ہو دستِ ہنر، وہ جسم و جاں کا بوجھ ہے
دل میں جذبہ ہی اگر باقی نہ ہو تعمیر کا

جب فضا سے خون کے قطرے گرے، یاد آ گیا
وہ جو اک حلقہ سا ہوتا تھا کبھی زنجیر کا

درد کی دولت کہاں لے جاؤں سارے شہر میں
ایک بھی وارث نہیں ملتا مری جاگیر کا

کاغذی ہوتا نہ پھر پیراہنِ ہستی، منیر
دوسرا رخ دیکھ لیتے ہم اگر تصویر کا

وسعتوں کا ہے بھرم گردِ سفر کھلنے تک
آسماں پیچھے نہ رہ جائیں یہ پر کھلنے تک

کوئی گردش تھی نہ صورت تھی، فقط حیرت تھی
چاک، صد چاک تھا مٹی کا ہنر کھلنے تک

اب بھی میں سحر زدہ ہوں تو تحیّر کیسا
کتنے در مجھ پہ کھلے تھے ترا در کھلنے تک

جو بھی کہتا تھا کوئی، مان لیا کرتے تھے
کتنے خوش وقت تھے ہم مشتِ خبر کھلنے تک

اس لیے شام سے پہلے میں پلٹ آتا ہوں
لوٹ جائیں نہ پرندے مرا گھر کھلنے تک

مختصر اتنی بھی کب تھی مری چادر، سیفی
پاؤں تو ڈھانپ ہی سکتا تھا میں سر کھلنے تک

جب بھی گل اندام لکھے
خوشبو سے پیغام لکھے

مرہم اپنے پاس رکھا
زخم ہمارے نام لکھے

پانی سے آغاز ہوا
اور ہوا انجام لکھے

بے گھر ہی پڑھ سکتے ہیں
جو پیڑوں پر شام لکھے

- پھر بھی نقش نہ ابھرے وہ
میں نے رنگ تمام لکھے

وہ تو خوشیاں لکھ دیتا
میں نے خود آلام لکھے

تصویروں نے ماتھے پر
خود ہی اپنے دام لکھے

خوش قسمت ہے، سیفیؔ، وہ
وقت جسے ناکام لکھے

بدلے ہیں کس تیزی سے حالات مرے
کیسے کیسے لوگ تھے ورنہ ساتھ مرے

امن کے گیت لکھوں یا خالی پیٹ بھروں
آیا ہے بس ایک کبوتر ہات مرے

شہر کے دروازوں پر پہرہ بٹھلا دو
سُونے ہوتے جاتے ہیں دیہات مرے

گھر میں صحرا دیکھ کے واپس لوٹ گیا
دروازے تک آیا دریا ساتھ مرے

تیرے نام پہ جو بھی اچھے کام ہوئے
اپنے آپ پہ تھے وہ احسانات مرے

سیفیؔ، جب میں اس کے دھیان میں ہوتا ہوں
لمحوں میں ڈھل جاتے ہیں دن رات مرے

یہ بھی نہیں کہ زیست کبھی دلنشیں نہ تھی
بس میری آرزو کے برابر حسیں نہ تھی

گھر سے اس ایک شخص کا جانا تھا اس کے بعد
جس کا جہاں مقام تھا، وہ شے وہیں نہ تھی

کھلتا بھی مجھ پہ کیسے یہ بابِ طلسمِ وہم
جب میری جیب ہی میں کلید یقیں نہ تھی

- اعجازِ نقشِ پا کے سوا اور کیا کہیں !
سجدے سے سر اٹھا کے جو دیکھا، جبیں نہ تھی

بس ایک ہی خلش تھی فرازِ صلیب پر
سب کچھ تھا میرے پاؤں کے نیچے زمیں نہ تھی

—

کس کس سے اپنا روگ چھپاؤ گے تم منیر
کیوں بت بنا لیے تھے اگر آستیں نہ تھی

- وہ تو نقش نہ پھر نقاش نے سوچا تیرے جیسا
ورنہ دنیا میں ہر چہرہ ہوتا تیرے جیسا

- دیواریں تھیں یا آئینے، جگنو پھوٹ رہے تھے
میں نے تیرا نام لکھا اور لکھا تیرے جیسا

- سات سمندر مل کر اس کے گرد دھمالیں ڈالیں
جس قطرے کی قسمت میں ہو دریا تیرے جیسا

جس دن سے تج دی ہیں تو نے میری خاطر نیندیں
اس دن سے مجھ پر بھی خواب نہ اترا تیرے جیسا

کم سے کم اک بات تو ہم دونوں میں سانجھی ٹھہری
میں بھی اپنے آپ میں تنہا نکلا تیرے جیسا

اپنی اپنی وسعت سیفیؔ، اپنے اپنے جوہر
اپنی ذات میں ہر ذرہ ہے صحرا تیرے جیسا

❁

کس نے رکھی تھی شہر کی بنیاد
گاؤں کے گاؤں ہو گئے برباد

دل بھی پہلو میں اک عجب شے ہے
پل میں آباد، پل میں غیر آباد

جانتی ہیں یہ ادھ کھلی آنکھیں
موسمِ گل بھی ہے خزاں افتاد

دل کو ان سے نجات کیسے ہو
وہم، دل نے جو کر لیے ایجاد

کچھ فضا شہر کی تھی سم آلود
کچھ ہماری سرشت میں تھا فساد

قاتلوں کو ملی ہیں جاگیریں
اور مقتول صرف زندہ باد

زیست کرنا بھی معجزہ ہے، منیر
جس طرف دیکھیے تضاد، تضاد

زندگی، کرب فاصلوں کا ہے
موت، آزار قربتوں کا ہے

کربلا ایک سنگ میل نہیں
کربلا، نام منزلوں کا ہے

آپ بھی شہر میں ہیں آئے ہوئے
اور موسم بھی رتجگوں کا ہے

۔ آپ کا ذکر، آپ کی یادیں
سلسلہ ایک خوشبوؤں کا ہے

پیار میں لوگ جان دیتے تھے
ذکر جانے یہ کن دنوں کا ہے

روشنی بانٹتا رہوں گا، منیرؔ
جب تلک ساتھ جگنوؤں کا ہے

آنکھ سمندر آنسو دریا بن سکتا ہے
جیسا چاہو گھر کا نقشہ بن سکتا ہے

کیسے کیسے نقش تراشیں زخمی پوریں
آئینہ ٹوٹے تو کیا کیا بن سکتا ہے

۔ تم کو دیکھنے سے پہلے کب یہ سوچا تھا
اک چہرہ بھی پوری دنیا بن سکتا ہے

— اس کی خوشبو جذب اگر شعروں میں کر لوں
میرا نام بھی ایک حوالہ بن سکتا ہے

شہر بدر ہو جانے سے کیوں گھبراتے ہو
ہم دونوں سے ایک قبیلہ بن سکتا ہے

بچھ جاؤ گر پیروں میں تم بچھ سکتے ہو
رستہ بن جاؤ تو رستہ بن سکتا ہے

سب آثار سبھی اطوار وہیں جیسے ہیں
خیر سے میرا شہر بھی کوفہ بن سکتا ہے

لے وہ کب تیشۂ فرہاد صنم ساز میں ہے
جو رگِ سنگ سے اٹھتی ہوئی آواز میں ہے

زندگی کیا ہے' اندھیرے سے اندھیرے کا سفر
میرا انجام بھی مضمر مرے آغاز میں ہے

تیری آواز سنی : گویا تجھے دیکھ لیا
تیری صورت' ترا نقشہ' تری آواز میں ہے

ذہن میں کیسے احاطہ ہو تری عظمت کا
ماورا تک بھی ترے حلقۂ پرواز میں ہے

معنی و صوت کا آہنگ کہاں دلی میں
معنی و صوت کا آہنگ تو شیراز میں ہے

بات نکتے کی بتاتا ہوں، زرا غور سے سن
جو ہے انجام سے آگے وہی آغاز میں ہے

اتنی پروازِ فلک بوس میں کب ہے، سیفی
زندگی جتنی نہاں حسرت پرواز میں ہے

میلے میں کیا رنگینی تھی، یہ بھی اس کو یاد نہیں
باپ کی انگلی کب چھوٹی تھی یہ بھی اس کو یاد نہیں

یاد نہیں کب پگڈنڈی سے وہ سڑکوں پر آیا تھا
پہلی ٹھوکر کب کھائی تھی، یہ بھی اس کو یاد نہیں

نیند کے کس عالم میں تھا، کس اسٹیشن پر اترا تھا
اس کی گاڑی کب چھوٹی تھی یہ بھی اس کو یاد نہیں

مٹھی میں اک تیلی تھامے گھوم رہا ہے برسوں سے
ہات میں قفلی کب پگھلی تھی، یہ بھی اس کو یاد نہیں

کس کے گھر میں آنکھ مچولی کھیل رچایا کرتا تھا
کس کے آنگن میں پیری تھی یہ بھی اس کو یاد نہیں

گاؤں میں اس کی یاد میں جو چھپ چھپ کر رویا کرتی تھی
آنکھ وہ کالی یا نیلی تھی، یہ بھی اس کو یاد نہیں

یاد آتا ہے حوالوں کی طرح
مجھ پہ برسا تھا جو نغموں کی طرح

گھورتی رہتی ہیں سارے شہر کو
کھڑکیاں، ویران آنکھوں کی طرح

زندگی کرنا بہت آسان ہو
رہ سکوں گر میں بھی اندھوں کی طرح

منھ دکھاؤں گا میں کیا اسلاف کو
ہو گئے ہیں گاؤں، شہروں کی طرح

خاک ہو گلشن سے خوش بو کا گزر
شاخِ گل ہو جب صلیبوں کی طرح

آج اِس چھت پر تو کل اُس صحن میں
لڑکیاں ہوتی ہیں چڑیوں کی طرح

چاؤ سے بیاہوں گا اک دن میں انھیں
میں نے غم پالے ہیں بچوں کی طرح

میری پیشانی کو چومے آسماں
بچھ گیا ہوں میں زمینوں کی طرح

کچھ نہیں ماسوا تو سوچنا کیا
جب خدا کہَ دیا تو سوچنا کیا

اک وہی کیوں ہے اور کیسے ہے
جب نہیں سوچنا، تو سوچنا کیا

عکس صد رنگ دل پہ ابھریں گے
آنکھ ہے آئنہ تو سوچنا کیا

کوئی سورج بچا کے رکھ لیتے
اب دیا بجھ گیا تو سوچنا کیا

دھوپ کا احتساب کیوں نہ کیا
پیڑ ویراں ہوا تو سوچنا کیا

فیصلے کی گھڑی ہی مشکل تھی
فیصلہ کر لیا تو سوچنا کیا

کوئے جاناں کی سمت خود ہی، منیر
لے اڑے جب ہوا تو سوچنا کیا

لوگوں کو پھر کم ہی بتلاتے ان کی تقدیر فقیر
غور سے گر پڑھ لیتے اپنے ہاتوں کی تحریر فقیر

خلوت خلوت جھانک آیا ہوں، محفل محفل دیکھ چکا
اک جیسے سب صاحب ثروت، اک جیسے سب پیر فقیر

حیرانی کے کس عالم میں حسن اسے لے آیا ہے
آپ مصور، آپ تصور، آپ ہُوا تصویر فقیر

دل کی دھڑکن تا تھیّا تا تھیّا میں جب ڈھل جائے
سرمستی میں ناچے، لاکھ ہو پیروں میں زنجیر فقیر

جس میں دکھ سکھ دھوپ گھٹا اور شام سویر ہیں بے معنی
اک نگری ایسی ہے جس کو کرتے ہیں تعمیر فقیر

اور اک تو ہے، شہر میں آکر اپنے آپ کو بھول گیا
اور اک وہ ہے جنگل بیلے ڈھونڈے تجھ کو ہیر فقیر

دیر سویر تو ہو جاتی ہے اس کا دامن تھام رکھو
جس کا نام دوا ہر دکھ کی، جس کا غم اکسیر فقیر

ہم بھی نیندیں تج کر سیفیؔ آوان کے ساتھ چلیں
پیچھے خواب ہیں بنتے، پہلے لکھتے ہیں تعبیر فقیر

❁

کب ممکن تھا کرب، الم، آزار کی بات نہ لکھتا
لکھنے بیٹھتا اور تیرے شہکار کی بات نہ لکھتا

ممکن ہے میں اپنے ایک اک حرف کو چوما کرتا
یہ بھی ممکن ہے تیرے معیار کی بات نہ لکھتا

کاش مؤرخ کوئی جو لکھتا جمہور کی باتیں
کاش اک ایسا شاعر جو دربار کی بات نہ لکھتا

اس کی یاد میں جو لمحے گزرے تھے، یاد نہ آتے
ہجر کی خوشبو، قربت کی مہکار کی بات نہ لکھتا

اپنے دل کی بات تجھے بتلاتا کون، اگر میں
اپنے شعروں میں اپنے گھر بار کی بات نہ لکھتا

ہم ہی درس بھلا بیٹھے ہیں ورنہ آج بھی بچہ
'پ' سے پیار لکھا کرتا، پیکار کی بات نہ لکھتا

بارش، آندھی، زلزلہ، جو چاہے لکھ دیتا، سیفی
گھر آنگن جو بانٹ دے اس دیوار کی بات نہ لکھتا

کوئی تو تھا مرے قریں موجود
کس گماں کا رہا یقیں موجود

ڈھونڈنے جائیں بھی تو جائیں کہاں
تو کہاں ہے ؟ کہاں نہیں موجود

پھر اسے کیسے لامکاں کہہ دوں
وہ مکاں، ہے جہاں مکیں موجود

نیند ہے، خواب ہے کہ برزخ ہے
آسماں ہے نہ ہے زمیں موجود

ایسے ہوتے ہو جیسے ہوتے نہیں
یوں بھی ہوتے ہیں کیا کہیں موجود

سر نہ ہونے سے کچھ نہیں ہوتا
دیکھ لو یہ رہی جبیں موجود

پیڑ اگتے نہیں خلاؤں میں
آسمانوں میں ہے زمیں موجود

ایک تو حرف کا سلوک اپنا
ہر قدم اس پہ نکتہ چیں موجود

جب مرا قتل ہو رہا تھا، منیر
اتفاقاً تھا میں وہیں موجود

جب بھی کوئی زخم پرانا پڑتا ہے
چن کر تیرا غم دہرانا پڑتا ہے

میں آنکھوں کے رستے آتا جاتا ہوں
ورنہ راہ میں ایک زمانہ پڑتا ہے

خود ہی راز کی بات زباں پر لاتا ہوں
خود ہی اپنا ہات دبانا پڑتا ہے

شور میں ایک صدا ایسی بھی ہوتی ہے
لاکھ نہ جانا چاہیں، جانا پڑتا ہے

پہلے شہر بسا لیتے ہیں ساحل پر
پھر دریا پر بند بنانا پڑتا ہے

- خیر نہیں مل سکتی اس دروازے سے
جس پر اپنا نام بتانا پڑتا ہے

سیفی، یہ افلاک کے بس کی بات نہیں
بس دھرتی کو بوجھ اٹھانا پڑتا ہے

یوں تو تمھارا ساتھ غزالاں رہا بہت
میرے بغیر شہر بھی ویراں رہا بہت

کب روشنی ہو، کب ہو زیارت زمین کی
سورج تمام رات پریشاں رہا بہت

تو بھی انا پرست تھا، میں بھی انا پرست
تو بھی اداس، میں بھی پریشاں رہا بہت

وہ جس میں تیرے لمس کو زنجیر کر سکوں
مجھ سے وہ ایک لمحہ گریزاں رہا بہت

—

کل رات جل رہا تھا پڑوسی کا گھر، منیر
کل رات میرے گھر میں چراغاں رہا بہت

اگر ہے حُسن بھی حُسنِ نظر تو پھر کیا ہے
جو ہے تو کیا ہے، نہیں ہے اگر تو پھر کیا ہے

مکیں ملا تھا کوئی؟ دل پہ ہات رکھ کے کہو
تلاش کر بھی لیا تم نے گھر تو پھر کیا ہے

سفر سے پہلے سفر تھا، سفر کے بعد سفر
یہ دائرے میں نہیں ہے سفر تو پھر کیا ہے

پھر اس کے بعد تو سونا ہے عمر بھر کے لیے
میں جاگتا بھی رہوں عمر بھر تو پھر کیا ہے

زمیں سے سیکھا ہے دم سادھنے کا فن میں نے
ہوا سے آپ نے سیکھے ہنر تو پھر کیا ہے

وہ سورجوں سے کرے اہتمامِ صبح منیر
میں اک اذان سے کر دوں سحر تو پھر کیا ہے

میں وہ قطرہ ہوں جو مٹی کی پوشاک میں رہتا ہے
تیز ہوا کا جھونکا اکثر میری تاک میں رہتا ہے

شام اترتے ہی چڑھ جاتا ہے افلاک کی سولی پر
وہ تارا جو دن ڈھلنے تک میری خاک میں رہتا ہے

ہر تخلیق کا باعث گردش کی تحریریں ہوتی ہیں
کوزہ تو کوزہ ہے، کوزہ گر بھی چاک میں رہتا ہے

چاٹ لیا کرتا ہے وہ قصرِ پندار کی دیواریں
جگنو جو آنکھوں میں، شعلہ جو خاشاک میں رہتا ہے

ہر نووارد کی ہمت، میں آپ بڑھایا کرتا ہوں
درد کا ایک قبیلہ اب میری املاک میں رہتا ہے

— حیرت کیا گر اس کے پیروں کے نیچے افلاک رہیں
جب بھی دیکھو، سیفیؔ کو، شہرِ لولاکؐ میں رہتا ہے

فصیل جاں میں دریچہ کوئی عطا کرکے
ہمارے جبس کو دیکھو کبھی ہوا کرکے

اب آگے دیکھیے کیا ہو سلوکِ راہ گزر
نکل تو آئے ہیں ہم گھر سے حوصلہ کرکے

— تمھارے دستِ سخاوت پہ حرف آتا ہے
ہمارا کیا ہے چلے جائیں گے صدا کرکے

نہ دم گھٹے نہ اندھیروں کی حکمرانی ہو
ہوا چلے جو چراغوں سے مشورہ کر کے

قلق یہی ہے کہ شب خون اس نے مارا ہے
وہ جیت سکتا تھا مجھ سے مقابلہ کر کے

پھر اس سے ملنے کی ایسی بھی کیا پریشانی
اگر ہے لوٹنا اپنا ہی سامنا کر کے

تو جان لیجیے وہ فیصلہ درست نہیں
اگر سبک نہ ہو رفتار فیصلہ کر کے

پے دفاع تو سر بھی تھا اور گھر بھی تھا
مگر چراغ بچا لائے قرض ادا کر کے

جب اس سے آپ نے، سیفی اسی کو مانگا تھا
پھر اضطراب تو بڑھنا ہی تھا دعا کر کے

سورج عکس، ہوائیں عکس ہیں، مٹی عکس، سمندر عکس
آئینے کے اندر چہرہ، آئینے کے باہر عکس

آئینوں کے بیچ کسی دن اپنے آپ کو رکھ کر دیکھ
نقطہ لشکر بن جائے گا، ہوں گے عکس کے اندر عکس

کشتی، تیز ہوا اور دریا، سب ساکت ہو جاتے ہیں
ڈال دیا کرتے ہیں جب سوچوں میں اپنے لنگر عکس

یوں بھی ہوتا ہے سب خال و خط مدھم پڑ جاتے ہیں
یوں بھی ہوتا ہے آنکھوں کو ہو جاتے ہیں ازبر عکس

پھر یوں ہوتا ہے آنکھیں پتھرا دیتی ہیں شیشے کو
پھر یوں ہوتا ہے پانی پر ہو جاتے ہیں پتھر عکس

جانے گھر کی لاج پہ کس نے اپنے آپ کو وار دیا
جانے آیا ہے پانی کے ساتھ کہاں سے بہ کر عکس

اک دوجے سے یکسر غافل، اک دوجے سے بے پروا
جسم آلود ہیولے ہیں یا چلتے پھرتے گھر گھر عکس

سیفیؔ، پھر بستی سے ہجرت کر جانا ہی اچھا ہے
جب سایہ ہو پیڑ سے افضل اور صورت سے بہتر عکس

✓

خوشبو، رنگ، اجالا مجھ پر ختم ہوا
میں کیا تھا اور کیا کیا مجھ پر ختم ہوا

جانے والی ساعت میرے دم سے تھی
آنے والا لمحہ مجھ پر ختم ہوا.

دنیا کی تخلیق کا باعث میں ہی تھا
سارا کھیل تماشا مجھ پر ختم ہوا

تم پر حسن کی سب تمثیلیں ختم ہوئیں
اور محبت کرنا مجھ پر ختم ہوا

جب جب پھیلا سوچ کی حد سے باہر تھا
جب جب نقطہ سمٹا مجھ پر ختم ہوا

مستقبل، اک خواب، تمھارے سامنے ہے
ماضی ایک حوالہ مجھ پر ختم ہوا

یوں لگتا ہے میں بھی ایک سمندر ہوں
اک اک درد کا دریا مجھ پر ختم ہوا

موسیقار کے بس میں کب ہے لَے کو لوَ میں ڈھالے
ایک اَن دیکھا ہات بھی ہوتا ہے سازوں کے پیچھے